© rasailojaraid.com

میں ان کو امن حاصل ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المقدس کے عیسائی اگر یہ چاہیں کہ وطن سے نکل کر رومیوں کے ساتھ جاکر رہیں تو ان سے بھی کوئی تعرض نہ کیا جائے گا بلکہ ان کی گرجائیں وغیرہ جو بیت المقدس میں ہیں، محفوظ ہوں گی۔

اب دنیا کو چیلنج ہے۔ بتائے کہ کوئی فاتح ملک یا حکمران اپنے مفتوحہ ملک کے رعایا اور عوام کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرسکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر منصفانہ برتاؤ کا تصور کیا جاسکتا ہے؟

اس سے زیادہ عدل و انصاف کا نمونہ بھی ملاحظہ کریں کہ سیدنا عمر فاورق ؓ نے حکم دیا کہ ان عیسائیوں کی جان و مال مسلمانوں کی جان و مال کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے تو اس کے بدلے میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا۔ حضرت امام شافعیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے لکھ کر بھیجا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ قاتل کو مقتول کے وارث کو جس کا نام حنین تھا، حوالے کردیا گیا۔ اس نے اس مسلمان قاتل کو اپنے مقتول کے بدلے قتل کردیا۔ جائداد کے متعلق بھی یہ قانون بنایا گیا کہ جو زمینیں ان کے قبضہ میں تھیں، وہ فتح کے بعد بھی اسی طرح بحال کردی گئیں اور مزید یہ کہ مسلمانوں پر وہ زمینیں خریدنے کو پابندی عائد کردی گئی۔

کفر ایک باطنی لعنت ہے۔ اس کا اثر باطن پر زیادہ ہوتا ہے جبکہ فسق و فجور کے اثرات ظاہر پر زیادہ پڑتے ہیں۔ پاکباز مؤمن کا چہرہ نورانی ہوتا ہے جبکہ گنہگار کے چہرے پر وحشت اور بے رونقی نمایاں ہوتی ہے۔ ''اللہ جمیل ویحب الجمال'' کے مطابق مؤمن کو باطن کے ساتھ ظاہر کو بھی پاک اور مزین کرنا چاہیے۔

خدمت میں عظمت

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب پہلے خلیفہ رسولؐ متعین ہوئے تو خدمت خلق کے ایسے کام جو منصب خلافت سے پہلے سرانجام دیتے تھے وہ کام خفیہ طور پر بعد میں بھی ادا کرتے رہے۔

ایک مرتبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بوڑھی عورت کے گھر کو دیکھا تو ارادہ کرلیا کہ کل سے اس گھر کی صفائی کرتا رہوں گا۔ صبح کو وہ گھر پہنچے تو پہلے ہی کوئی شخص صفائی کرکے جاچکا تھا۔ دوسرے دن کچھ سویرے آئے پھر بھی گھر کی صفائی کوئی شخص کرچکا تھا۔ تیسرے دن بہت سویرے اندھیرے میں ہی پہنچ گئے۔ وہاں دیکھا کہ اس وقت کوئی شخص صفائی کرکے گدے باہر نکال رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو وہ عظیم انسان خلیفہ رسول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چیخ نکل گئی کہ اے ابوبکرؓ! نیکی کے کاموں میں آپ سے کوئی سبقت حاصل نہیں کرسکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظفر حسین ایبک

انقلابی سفر کی کہانی

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے برصغیر کی آزادی کے لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر گیارہ سال افغانستان، روس اور ترکی میں گذارے۔ اس عرصہ میں جناب ظفر حسین ایبک مرحوم بھی آپ کے ساتھ رہے۔ انہوں نے اس دور کے واقعات اور مناظر کو جس طرح دیکھا اس کو قلمبند کیا۔ یہ انقلابی داستان آپ پڑھ کر آج کے حالات میں رہنمائی حاصل کریں۔ (ادارہ)

امیر کابل کی درباری زندگی

امیر حبیب اللہ خان اپنے آخری زمانے میں یعنی 1915ء سے لے کر 1919ء تک ایسے عیش و عشرت میں پڑ گئے تھے کہ ملک کے اندرونی و بیرونی حالات سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ ولی عہد سردار عنایت اللہ خان معین السلطنۃ ایک ضعیف کیریکٹر کا آدمی تھا۔ اپنے باپ کی طرح انگریزوں کا طرف دار تھا اور افغانستان کو انگریزوں کے خلاف استعمال کیے جانے کا مخالف تھا۔ امیر صاحب کا چھوٹا بھائی سردار نصر اللہ خان نائب السلطنۃ ولی عہد کا رقیب سمجھا جاتا تھا۔ امیر صاحب کو جب کبھی کسی مسئلہ میں انگریزوں پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو وہ نائب السلطنۃ اور حاجی عبدالرزاق خان کے ذریعے جو دیوبند کے تعلیم یافتہ اور کابل کے قاضی القضاۃ تھے، معاملات کرایا کرتے تھے۔ سردار نصر اللہ خان ایک قدامت پسند آدمی تھا۔ امیر صاحب کے تیسرے فرزند سردار امان اللہ خان عین الدولہ اپنی بارسوخ والدہ ملکہ علیا حضرت کی وجہ سے لوگوں میں ہر دلعزیز تھے اور جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ جب امیر صاحب سردیوں میں جلال آباد جاتے تو سردار امان اللہ خان عین الدولہ کابل کی گورنری کے فرائض ادا کرتے تھے۔

ملک کے روشن خیال نوجوان ایک دستوری حکومت قائم کرنے اور افغانستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے خواہاں تھے۔ ان لوگوں کے لیڈر ایک طرف تو سردار محمود بیگ طرزی اور دوسری طرف سردار محمد نادر خان مانے جاتے تھے۔ یہ روشن خیال نوجوان زیادہ تر سردار امان اللہ خان کو پسند کرتے تھے اور اسی کے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح ملک میں تین سیاسی زمرے (گروپ) موجود تھے۔ ایک امیر حبیب اللہ خان اور ولی عہد سردار عنایت اللہ خان کا گروپ، دوسرا سردار نصر اللہ خان معین السلطنۃ کا حزب، تیسرا سردار امان اللہ خان عین الدولہ کا زمرہ۔ امیر صاحب کی عیش عشرت کی وجہ سے لوگوں میں ان کے برخلاف ناخوشی کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔ ان کو قتل کرنے کے لئے دو مرتبہ کوشش کی گئی لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

1915ء میں ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن کے کابل پہنچنے پر (جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھا جائے گا) ملک کے بیرونی تعلقات میں اگرچہ ذرا چہل پہل پیدا ہوگئی تھی، لیکن امور داخلہ بالکل طاق نسیان میں پڑے ہوئے تھے۔ امیر صاحب ایک غیر ذمہ دار بادشاہ ہونے کی وجہ سے امور سلطنت کو بالکل اپنی مرضی کے مطابق چلایا کرتے تھے۔ مہینوں دربار نہیں ہوتا تھا حالانکہ قیدیوں کے مقدمے خود ان کی طرف سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حل وفصل ہوتے تھے۔ بیچارے قیدی خواہ مجرم ہوں یا کسی گمان کی وجہ سے قید میں ڈال دیے گئے ہوں، مہینوں قید خانوں میں پڑے رہتے۔ امیر صاحب کی چار منکوحہ بیگمات کے سوا روایت کے مطابق 100 کنیزیں (باندیاں) بے نکاح ان کے حرم سرائے میں رہتی تھیں۔

ہر سال مختلف قبیلوں سے خوبصورت لڑکیاں چنی جاتیں اور امیر کے محل میں بھیجی جایا کرتی تھیں۔ ان رنگ رلیوں کی وجہ سے امیر صاحب کو سرکاری امور پر توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا تھا۔ وہ محل سے جب نکلتے تھے تو کسی پرفضا مقام پر کابل کے نزدیک خیمے لگا کر سارے درباریوں کے ساتھ کھانا پکانے اور سرود ونغمہ سے لطف اندوز ہونے میں سارا دن گزار دیتے تھے۔ ان کی ان سیر و تفریح کی مجلسوں کو دیگچہ پزانی ہنڈیا پکانے کی محفل کہا جاتا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ اتنے عصبی ہوگئے تھے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اور اپنے متعلقین کی ذرا سی غلطیوں پر نوکروں کو سخت سخت سزائیں دیتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ شجاع الدولہ نامی غلام بچے کو خیمہ ٹھیک نہ لگانے کی وجہ سے اتنے کوڑے لگوائے تھے کہ اس کے پیٹھ کی کھال اکھڑ گئی اور خون بہنے لگا تھا۔

امیر صاحب کی بیگمات میں سے علیا حضرت کا رسوخ اگرچہ کافی تھا لیکن وہ خوب صورت باندیوں کی وجہ سے ذرا نظر سے گر گئی تھیں۔

جن حالات اور جس ماحول میں ہم نے کابل میں زندگی شروع کی اس کا ایک مختصر سا خاکہ اوپر کھینچ دیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام کو کچھ اندازہ ہوسکے کہ ہمیں افغانستان میں اس زمانے میں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کابل کے لوگ ہم سے کتراتے تھے اور ہم سے بولنے کی جرأت نہ کرتے تھے، کیونکہ افغانی پہرہ دار سپاہی ہمیشہ سایہ کی طرح ہمارے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اگر کوئی ہم سے بات کرنا چاہتا تو وہ ''موقوف است'' (یعنی منع ہے) کہہ کر بولنے والے کو جھڑک دیتا تھا۔ ہم جنگ اور دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر تھے کیونکہ کابل میں (جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے) سراج الاخبار کے سوا کوئی اور اخبار نہ نکلتا تھا۔ اس اخبار میں اندرونی خبروں، امیر اور شہزادوں کی تعریف کے سوا اور کوئی ایسا مضمون نہ ہوتا تھا جس میں ہمیں دلچسپی ہو۔ رفتہ رفتہ ہمیں معلوم ہوا کہ سول اسپتال میں ڈاکٹر منیر بیگ ہندوستان سے روزانہ ایک دو اخبار منگایا کرتے ہیں جس کا ترجمہ ان کو ہندوستانی کمپونڈر سنایا کرتے ہیں۔ ہم بیماری کے بہانے اسپتال جانے لگے اور اس طرح ڈاکٹر منیر بیگ سے رابطہ بڑھا لیا۔ وہ ہمارے ساتھ آنے والے سپاہی کو اسپتال کے دروازے پر رکوا دیتے تھے جس سے ہم شفاخانہ کے اندر بہت آزادی سے چل پھر سکتے تھے اور ہندوستانی کمپونڈر سے کھل کر باتیں کرلیا کرتے تھے۔ یہاں اخبار پڑھ کر اکثر میں اور خوشی محمد واپسی پر خبروں کا خلاصہ اپنے دوستوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ اسپتال میں ہفتے میں ایک دو دفعہ جانے سے نظربندی کا بار قدرے ہمارے دلوں سے اٹھ جاتا تھا۔

ہم کابل میں اس امید پر دن گزار رہے تھے کہ کسی روز ہم کو امیر صاحب اپنے حضور میں طلب کریں گے اور ہم کو ترکی جانے اور وہاں جاکر جہاد میں شریک ہونے کا موقع دیں گے۔ جب کابل میں رہتے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے تو ہم نے کوتوال شہر سے درخواست کی کہ بادشاہ کے حضور میں ہمیں پیش کردے لیکن بجائے اس کے کہ وہ ہم کو کھلم کھلا کچھ کہے، وہ ہمیں جھوٹی تسلیاں دیتا رہا اور ہمیشہ لیت ولعل کرتا تھا۔ کبھی کبھی ہمارا مہمان دار یا اپنی طرف سے بات بنا کر یا کوتوال کے اشارے سے ہم کو کہہ دیتا تھا کہ ''عنقریب دربار ہوگا اور آپ لوگوں کو امیر صاحب کے حضور میں پیش کیا جائے گا۔'' ہم اپنی سادہ لوحی کے سبب ان وعدوں پر یقین کرلیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہر شخص ہمیشہ ایک جوڑا صاف اور دھلے ہوئے کپڑوں کا تیار رکھا کرتا تھا کہ اگر کہیں دفعتاً اس قسم کی پیشی ہوجائے تو حیثیت قائم رہے۔

جب ہم انتظار کرتے کرتے بہت تنگ آگئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو شیخ عبدالقادر نے تجویز کی کہ وہ ایک قصیدہ ولی عہد سردار عنایت اللہ خان معین السلطنتہ کی تعریف میں لکھ کر اس کو کوتوال کے ذریعہ ان کی خدمت میں پیش کرے اور اس طرح اپنے ساتھیوں کی ناگفتہ بہ حالت ان کو بتائے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر نے فارسی میں ایک اچھا خاصا اور لمبا قصیدہ لکھا اور اس کو کوتوال کو دیا تاکہ وہ معین السلطنتہ صاحب کی خدمت میں پیش کرے۔ ہم سمجھتے تھے کہ کوتوال صاحب ایک بارسوخ آدمی ہیں جو ہماری عرض اور اس قصیدے کو شہزادے کی خدمت میں پیش کردیں گے۔ ہم نے مدت تک اس کا انتظار کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر ہم سمجھ گئے کہ کوتوال صاحب میں اتنی جرأت ہی نہیں ہے کہ وہ معین السلطنتہ صاحب کے دربار میں بغیر بلاوے کے اور خود بخود جاکر ہمارے لئے چند ایک سفارشی کلمے کہہ سکیں۔

کوہاٹی مہاجر

ہم کو کابل پہنچے ہوئے کوئی دو ماہ ہوئے تھے کہ کوہاٹ سے چار طالب علم جنھوں نے کہیں سے یہ غلط خبر سن لی تھی کہ کابل میں ہماری بہت عزت اور خاطرداری ہورہی ہے، افغانستان میں داخل ہوگئے اور سرحد سے کابل لائے گئے۔ ان کو بھی ہمارے ساتھ کوتوالی میں اسی گھر میں جہاں ہم رہتے تھے، ایک کوٹھڑی میں جگہ دے دی گئی۔ ان میں سے عبداللطیف اور حافظ عبدالمجید مڈل پاس تھے اور فقیر شاہ اور پیر بخش پرائمری پاس تھے۔ ان لوگوں کی تعلیم وتربیت ناقص اور کم ہونے کی وجہ سے ہم ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود بھی ان سے چنداں نہیں ملتے تھے اور ان سے ذرا الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔

ابھی ہم کوتوالی ہی میں ٹھرے ہوئے تھے کہ کابل میں سخت ہیضہ پھیلا۔ ہر روز بہت سی موتوں کی خبریں ہم تک آتی تھیں۔ ہم نے کھانے پینے میں احتیاط تو بہت برتی، لیکن اس کے باوجود خوشی محمد کو ہیضہ ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوئی کا پانی وضو کے لئے استعمال کرنے کی وجہ سے جراثیم اس کے پیٹ میں چلے گئے، جس سے اس کو قے اور دست لگ گئے۔ رفتہ رفتہ قے اور دستوں کی وجہ سے کمزوری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ چارپائی سے بھی اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ میرے سوا دوسرے دوستوں نے اس کی تیمارداری سے ذرا پہلوتہی برتی۔ ابلے ہوئے پانی کے سوا اس کو کچھ اور نہ دیا جاتا تھا، حالانکہ قے اور پیاس کی وجہ سے اس کا حلق خشک تھا اور ابلا ہوا پانی اس کو بدمزا معلوم ہوتا تھا۔ وہ تازہ اور ٹھنڈا پانی مانگتا تھا۔ میں اس کو Potasslum Permanganate ٹھنڈے پانی میں گھول کر کلی کرنے کے لئے دیتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے یہ پانی کلی کرنے کی بجائے چھپا کر پی لیا۔ خدا کی شان اس سے اسے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے نقصان کے کچھ فائدہ ہوا اور اس کی قے بند ہوگئی اور بعد میں دست بھی تھم گئے۔ اس کو آدھی رات کے قریب ذرا نیند آگئی جس سے اس کی جان بچ گئی۔

کچھ دنوں بعد عبدالمجید کی پلک پر ایک پھنسی نکلی۔ بے احتیاطی کی وجہ سے یہ پھنسی بڑھ گئی اور اس کی آنکھ کی اوپر کی پلکیں بالکل گر گئیں۔ آنکھ کا اوپر کا پردہ زخم کی وجہ سے اتنا خراب ہوگیا کہ سوتے ہوئے بھی اس کی آنکھ کھلی نظر آتی تھی۔ آخر ڈاکٹر منیر بیگ کو کہا گیا۔ اس نے اس کی ران سے کھال لے کر آنکھ کے اوپر کے پردہ پر پیوند لگایا، جس کی وجہ سے عبدالمجید چند روز اسپتال میں رہا۔ یہ پیوند صرف ایک حد تک کھال سے جڑا اس لئے اس کی آنکھ پوری طرح بند نہ ہوتی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپریشن پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ جب عبدالحمید اسپتال میں تھا تو ایک روز اس سے ایک کابلی کمپونڈر نے باتوں باتوں میں پوچھا: ''شما از کجا آمدید؟'' (آپ کہاں سے آئے ہیں؟) اس نے جواب دیا: ''از لاہور آمدیم'' (ہم لاہور سے آئے ہیں) اس پر وہ کمپونڈر کہنے لگا: ''شما از لورکلان آمدید یا از پنڈی؟'' (آپ بڑے لاہور سے آئے ہیں یا لاہور پنڈی سے؟)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معلوم ہوتا ہے کہ کابل کے یہ لوگ راولپنڈی کو ''لورپنڈی'' اور خود لاہور کو ''لورکلاں'' کہا کرتے تھے۔ یعنی ان کو راولپنڈی کا صحیح تلفظ نہیں آتا تھا۔

اس کے بعد وہ کمپونڈر کہنے لگا ''مالیر خوب نہ داریم لاکن سرکہائے خوب داریم۔ شما در ہندوستان سرک دارید؟'' (یعنی ہمارے ملک میں ریل تو نہیں ہے لیکن اچھی اچھی سڑکیں موجود ہیں۔ کیا ہندوستان میں بھی سڑکیں ہیں؟)

قارئین خیال فرمائیں کہ کابل کے اس زمانے میں پڑھے لکھے کمپونڈر جیسے لوگوں کی معلومات ہندوستان کے بارے میں کتنی کم اور ناقص تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس زمانی میں ہندوستان کو افغانستان سے بھی زیادہ پسماندہ اور کم ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔

اس زمانے کے کابلی تاجروں کے رویہ اور کاروباری قابلیت کے متعلق بھی یہاں ایک مثال لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم ایک روز اللہ نواز کے لئے ایک بوٹ کا جوڑا خریدنے کو کابل کے مشہور بازار سرپلی چشتی گئے۔ ہم نے ایک سوداگر سے 7 نمبر کا بوٹ مانگا۔ اس نے جواب دیا: ''غالباً سات نمبر کا جوتا تو میرے پاس نہیں لیکن آٹھ نمبر کا موجود ہے اور میں ابھی اس کو سات نمبر کا بنائے دیتا ہوں۔'' ہمیں یہ سن کر تعجب ہوا کیونکہ ایک چھوٹے اور تنگ بوٹ کو تابوت پر چڑھا کر کچھ کھول دینا اور کچھ ڈھیلا کرنا تو ممکن ہوتا ہے، لیکن بڑے نمبر کے جوتے کو چھوٹا اور تنگ بنانا کیسے ممکن ہے؟ یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا اس لئے ہم اس سوداگر صاحب کے بڑے نمبر کے جوتے کو چھوٹے نمبر کا بوٹ بنانے والے ہنر کے دیکھنے کے منتظر رہے۔ اس نے کچھ چیتھڑے اور روئی لے کر بوٹ کے اندر بوٹ کے نوک کی طرف ٹھونس دیے اور بڑے فخر سے کہنے لگا: ''اینہ صاحب ہفت نمبر شد'' (یہ لیجئے جناب! یہ بوٹ سات نمبر کا ہو گیا)

جون کا مہینہ ختم ہو چکا تھا کہ ہم کو کوتوالی کے گھر سے نکال کر ایک دوسری جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوتوال صاحب کو گھر کسی اور کام کے لئے درکار تھا، اس لئے ہم کو یہاں سے نکالنا ضروری تھا۔ ہمارے لئے سرکاری عمارتوں میں سے ایک چھوٹا سا دومنزلہ گھر جس میں ایک بڑا کمرہ اور اس کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی تھی اور جو ''محلہ خواجہ رواش'' میں پہاڑ کے دامن میں واقع تھا، چنا گیا۔ اس زمانے کی افغانی حکومت ہم جیسے ''مہمان شاہی'' کے لئے کرایہ پر مکان لے کر ان کو اس میں ٹھہرانے کی زحمت تو اختیار نہ کیا کرتی تھی، بلکہ ان گھروں میں سے جن کو عتاب شاہی کی وجہ سے ان کے مالکوں سے چھین لیا گیا تھا، ایک گھر ''مہمان شاہی'' کی حیثیت کے مطابق اس کی رہائش کے لئے مقرر کردیتی تھی۔ ان دنوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حیثیت حکومت کی نظروں میں بالکل گری ہوئی تھی کہ ہم کو یہ گھر دیا گیا جس کی دیواروں پر سفیدی کی بجائے مٹی کا لپاؤ تھا۔ کھڑکیوں میں ایک چھوٹا سا شیشہ لگا ہوا تھا جس سے کمرے میں روشنی بہت کم آتی تھی۔ زینہ کہنہ اور فرسودہ تھا۔ اس کے نیچے کی منزل میں ہمارے افغانی پہریدار رہتے تھے اور اوپر کی منزل میں ہم رات کو فرش پر لیٹ جایا کرتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قدر بڑھ گئی تھی اور ہم کو چار ماہ بعد ایک بہت اچھے گھر میں جگہ دی گئی، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کابل میں اس زمانے میں ایک آدمی کی قدر اور قیمت اس کی قابلیت کے متناسب نہیں بلکہ کسی بڑے آدمی کی سفارش یا ارباب حکومت کی مرضی پر منحصر تھی۔

جب ہم نے کوتوال کو اس گھر کی خرابی کے بارے میں کہا تو اس نے پڑتال کے لئے دو مرزا (کلرک) بھیجے۔ ہم نے ان کو گھر کے سب نقائص بتلائے مگر انہوں نے ہماری بات نہ مانی لیکن جب وہ پڑتال کے بعد سیڑھیوں سے اترنے لگے تو ٹوٹی ہوئی سیڑھی میں بڑے منشی کا پاؤں پھنسا جس سے وہ گر پڑا۔ اس پر اس نے دوسرے منشی کو کہا: ''نوشتہ کن، زینہ بجی مردار است) (یعنی لکھو، سیڑھیاں بالکل خراب ہیں) اگر وہ نہ گرتا تو شاید اتنا بھی نہ لکھتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس کے باوجود بھی یہ گھر بدلا نہ گیا اور ہم کوئی چار ماہ اسی تنگ و تاریک جگہ میں رہے۔

ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن کی آمد

ہم ابھی اسی گھر میں رہتے تھے کہ 7 اکتوبر 1915ء کو ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن یورپ سے ایران کے راستہ کابل پہنچا۔ اس مشن کے ہیڈ راجا مہندر پرتاب تھے جو ہاتھرس واقع نزدیک بنارس کے ایک جاگیردار تھے اور یورپ میں رہتے ہوئے انگریزوں کے برخلاف پہلی جنگِ عظیم میں جرمنوں سے مل گئے تھے۔ ان کے ساتھ مولانا برکت اللہ تھے جو اصل بھوپال کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے جاپان میں اشاعت اسلام کا کام کیا تھا اور بعد میں امریکہ میں بنی ہوئی غدار پارٹی میں داخل ہوکر انگریزوں کے خلاف کام کرنے لگے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران وہ بھی جرمنوں سے مل گئے تھے۔ ترکی نمائندے ایک ژاندار مری فرسٹ لیفٹیننٹ (Gendarmeriefirstlieut) کاظم بیگ تھے جن کو بعد میں کیپٹن کا رتبہ ملا تھا۔ جرمن ڈیلیگیٹ فون ہنٹس (Von.Heintisch) اور آسٹرین نمائندہ نیڈر مائر (Neider Mayer) تھا۔ اس وفد کے ممبروں کا فوٹو مجھے روس میں 1923ء میں راجا مہندر پرتاب نے دیا تھا۔

اس وفد کا مقصد امیر افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف اکسا کر افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانے کی تیاریاں کرنا اور اس طرح انگریزی فوجوں کے ایک معتد بہ حصے کو یورپین محاذوں کی بجائے ہندوستان میں رہنے پر مجبور کرنا اور جرمن اور ترکی فوجوں کو روس کے برخلاف زیادہ جنگ کرنے کا موقع دینا اور اگر افغانستان انگریزوں سے لڑ پڑے تو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا تھا۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب شاگرد رشید حضرت شیخ الہند محمود الحسن نے جو کابل میں حضرت شیخ الہند کے حکم سے آئے تھے، ان سے مل کر معلوم کیا تو پتہ لگا کہ راجا صاحب کا مقصد ہندوستان آزاد ہونے پر وہاں راجہ نیپال کی مدد سے ایک ہندو حکومت قائم کرنا تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کابل میں

مولانا عبیداللہ صاحب سندھی 15 اکتوبر 1915ء کو کابل پہنچے۔ وہ ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے مرحوم حکیم اجمل خان، مرحوم ڈاکٹر مختیار احمد انصاری، مرحوم مولانا محمد علی جوہر اور مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد سے دہلی میں ملے تھے اور ان کو حضرت شیخ الہند کے حکم سے اپنے کابل جانے کے متعلق اطلاع دی تھی۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے مقصدِ سفر کو پسند کیا تھا اور ان کی تائید کی تھی اور ان کو اپنا نمائندہ مان لیا تھا۔ قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم نے کابل آنے سے پہلے شیخ محمد ابراہیم کو، جو بمبئی یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے پاس کرچکے تھے اور وہ مولانا صاحب مرحوم کے بہت عقیدتمند تھے، کابل کے مکتبہ حبیبیہ میں معلم کے طور پر بھیج دیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری ولد مولوی عبدالقادر قصوری جو کیمبرج سے میتھے میٹکس کے رینگلر (Wrangler) تھے، حافظ احمد دین ہیڈ ماسٹر مکتبہ حبیبیہ کی تجویز سے اس اسکول میں معلم مقرر ہوگئے تھے۔ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے بھتیجے عزیز احمد تھے جو اب کراچی میں مشن روڈ نمبر 62 میں ایک مذہبی درسگاہ میں قرآن شریف کا سبق پڑھاتے ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم نے مولانا صاحب مرحوم کے کابل آنے سے پہلے ان کے لئے یہاں کی فضا کو تیار کردیا تھا اور یہاں کے سربر آوردہ لوگوں میں خاص کر سردار سپہ سالار محمد نادر خان (اعلیٰ حضرت نادر شاہ مرحوم) کے خاندان میں رسوخ پیدا کرلیا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کابل پہنچنے کے کچھ دنوں بعد اسی گھر میں رہنے لگے جہاں شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی رہتے تھے۔ یہ گھر کابل کے پرانے حصہ میں مشہور شور بازار کے نزدیک ایک گلی میں جس کو کوچہ حضرت صاحب کہا جاتا تھا، واقع تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قبلہ مولانا صاحب مرحوم سردار محمود بیگ طرزی اور سردار محمد نادر خان سپہ سالار کے نام تعارفی خطوط اپنے ساتھ لائے تھے۔ کابل پہنچنے سے پہلے انہوں نے سردار محمود بیگ طرزی کو خبر بھیجی تھی۔ ان کے کابل پہنچنے کے بعد سردار طرزی کا شاگرد عبدالہادی خان جو سراج الاخبار کے ادارے میں ان کا دست راست تھا، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں سردار محمود بیگ طرزی کی طرف سے ''خوش آمدید'' کہنے کے لئے آیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم سردار طرزی صاحب کے ذریعہ ان کے داماد سردار عنایت اللہ خان معین السلطنۃ سے ملے۔ شہزادے نے ایک روز قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو کھانے پر بلایا۔ اس طرح پر دوسرے افغان سرداروں کو بھی مولانا قبلہ صاحب مرحوم کے کابل پہنچنے کی اطلاع ہوگئی۔

قاضی القضاۃ حاجی عبدالرزاق خان جو افغانستان کے محکمہ شرعیہ کے (جس کو میزان التحقیقات شرعیہ کہتے تھے) رئیس تھے۔ دیوبند کے تعلیم یافتہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم کے شاگرد تھے۔ حاجی صاحب سردار نصراللہ خان نائب السلطنۃ کے ساتھ جو غیر سرکاری طور پر افغانستان کے سیاسی حالات خاص کر امور متعلقہ قبائل سرحد کا انتظام کرتے تھے، خاص تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو نائب السلطنۃ صاحب کی خدمت میں پیش کرنا چاہا لیکن قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ یہ ملاقات سردار معین السلطنۃ کے ذریعہ ہو۔ کیونکہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم اپنی فراست کی وجہ سے کابل میں پہنچتے ہی سمجھ گئے تھے کہ سرداروں کی باہمی رقابتیں ان کے کام میں رکاوٹیں ڈال سکتی ہیں۔ اس لئے ممکن حد تک ان رقابتوں کے جال میں پھنسے بغیر اپنا کام کرنا اور سلسلہ مراتب کا خیال رکھنا انہوں نے اپنے لئے ضروری سمجھا۔ حاجی صاحب نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی بات مان لی اور ان کو سردار نائب السلطنۃ کی خدمت میں سردار معین السلطنۃ کے ذریعہ پیش کرنا منظور کرلیا۔ اس کے لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے ایک عریضہ لکھوایا جس میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنا مقصدِ سفر مختصر طور پر یوں لکھا کہ وہ مسلمانان ہند کے نمائندے کے طور پر افغانستان آئے ہیں تاکہ شاہ افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائیں۔ اس طرح قبلہ مولانا صاحب مرحوم سردار معین السلطنۃ کے ذریعہ سردار نائب السلطنۃ سے ملے اور ان سے دو گھنٹے تک تخلیہ میں باتیں کرتے تھے۔

سردار نائب السلطنۃ نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے اس گفتگو کا خلاصہ مانگا جس کو قبلہ مولانا صاحب نے ساتھ آٹھ صفحات پر لکھا اور مسودہ شیخ محمد ابراہیم صاحب کو دکھلایا۔ انہوں نے اس میں بعض تبدیلیاں کیں جس سے اس کو صرف ہندوستانی مسلمانوں کی ایک تجویز کے بجائے تمام ہندوستان کی تجویز کا رنگ حاصل ہوگیا۔ یہ تحریر سردار محمود بیگ طرزی اور سردار معین السلطنۃ کو بھیج دی گئی۔ انہوں نے اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کو اپنے بھائی یعنی اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ سراج الملکۃ والدین کی خدمت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک روز نائب السلطنۃ نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنی کوٹھی پر بلایا۔ عصر کے وقت امیر صاحب بھی یہاں آگئے۔ انہوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنے حضور میں باریابی دی جیسا کہ مولانا مرحوم نے اپنی ذاتی ''ڈائری'' میں لکھا ہے۔ ان کو امید نہ تھی کہ وہ کابل پہنچ کر اتنی جلدی امیر افغانستان کے دربار میں باریابی حاصل کرسکیں گی۔

امیر حبیب اللہ خان نے قبلہ مولانا مرحوم کی تحریر کا بغور مطالعہ کیا اور مختصر الفاظ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کام کرنے کے لئے زبانی حکم دیا اور ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کی نصیحت کی۔ افسوس کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی اس تحریر کو جو سردار نائب السلطنۃ کے ذریعہ امیر حبیب اللہ خان کی خدمت میں پیش کی گئی تھی نہ کوئی نقل آج ہمارے پاس موجود ہے اور نہ اس کا مسودہ ملتا ہے جس سے اس کے مضمون اور مندرجہ جات کا پتہ ٹھیک طور پر اور مفصل مل سکے۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی کا مقصد اسلام کی خدمت تھا۔ وہ مسلمانوں کے لئے پھر وہی عزت کی جگہ حاصل کرنا چاہتے تھے جو ان کو انگریزی راج سے پہلے حاصل تھی۔ ان کے استاد شیخ الہند قبلہ مولانا محمود الحسن مرحوم کی ساری کوششیں اس کے حصول پر مرکوز رہی تھیں۔ انہوں نے اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے ان کو کابل اسی مقصد کے لئے بھیجا تھا، مگر کوئی خاص پروگرام اس بارے میں ان کو نہ دیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے افغانستان کو انگریزوں سے لڑا کر ہندوستان کا آزاد کرانا ضروری تھا۔ امیر حبیب اللہ خان انگریزوں کا دوست اور وظیفہ خوار تھا۔ ایسے شخص کو انگریزوں سے لڑنے پر آمادہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کو ایک ایسا لالچ دینا ضروری تھا جس سے وہ کم از کم ان کی بات تو سن لے۔ ہمیں اس کے کئی سال بعد قبلہ مولانا صاحب کے حصول کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ افغانی فوجیں ہندوستان پر حملہ کرکے اس کو انگریزوں سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوجائیں تو ایک افغانی شہزادہ دستوری بادشاہ کے طور پر دہلی کے تخت پر بیٹھے گا۔ امیر صاحب کی منظوری سے یہ شہزادہ امان اللہ خان عین الدولہ تھا اور افغانستان میں ایک دستوری بادشاہت قائم ہوگی اور ہندوستان اور افغانستان کے درمیان ایک معاہدے کے ذریعہ اتحاد قائم کیا جائے گا۔

قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے امیر صاحب کے حضور میں باریاب ہونے کے کچھ دن بعد ان کی اور حاجی عبدالرزاق کی کوششوں سے ہم کو بھی کوچہ حضرت صاحب کے اسی گھر میں جگہ دے دی گئی جس میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم، شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری رہا کرتے تھے، لیکن ہمارے لئے اس گھر کا سراچہ (یعنی مردانہ حصہ) مقرر ہوا۔ اس میں چار کمرے تھے۔ یہ حصہ سرائے یعنی اندرونی زنانہ حصے سے چھوٹا تھا لیکن اس کے باوجود بھی بہت آرام دہ تھا اور محلہ خواجہ رواش کے تاریک گھر کی نسبت بہت پرتکلف تھا مگر اس کی گلی یعنی کوچہ حضرت صاحب بہت تنگ اور کابل کے دوسرے کوچوں کی مانند بہت گندگی تھی۔ یہاں ہمارے لئے نئے بستر اور لحاف اور سردی میں گرم رہنے کے لئے صندلیاں اور فرش پر بچھانے کے لئے اونی دریاں جن کو کابل میں گلیم کہتے ہیں، گورنمنٹ افغانستان کی طرف سے خرید کر ہم کو دی گئیں اور ہمارا روزانہ وظیفہ دوچند کردیا گیا۔ اس لئے اب ہم کو روز مرہ خرچ کے لئے فی آدمی ایک افغانی روپے کی بجائے دو افغانی روپے ملنے لگے۔

قبلہ مولانا مرحوم نے ہمیں، مرحوم عبدالمجید خان کی جگہ ایک نیا سردار (پریزیڈنٹ) چننے کو کہا اور ہم نے اتفاق آرا سے عبدالباری صاحب کو اس عہدے کے لئے منتخب کرلیا۔ اس کے بعد جب مولانا صاحب مرحوم کو ہندوستانی، ترکی، جرمن وفد سے ملنے کی اجازت حاصل ہوگئی تو وہ عبدالباری کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے تاکہ وہ انگریزی میں ترجمانی کرے اور ان کی گفت وشنید سے بھی واقف ہو۔ آئندہ کے لئے جو منصوبے وہ بنائیں انہیں ان کے مشیر کے طور پر کام دے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ راجا مہندر پرتاپ کا مقصد بحیثیت پریزیڈنٹ ہند، ترک، جرمن مشن کے کچھ اور ہی تھا اور وہ ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہاں ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، مولانا برکت اللہ مرحوم ہندوستان سے مدتوں دور رہنے کی وجہ سے وہاں کے تازہ حالات اور مسلمانوں کی اہمیت سے بے خبر تھے، اس لئے وہ ہر بات میں راجا صاحب کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ جرمن نمائندے بھی راجا صاحب کی قابلیت کے قائل ہونے کی وجہ سے انہی کے نقطہ نظر کی تائید کیا کرتے تھے، لیکن قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم سے مل کر جرمن اور آسٹرین نمائندے کو معلوم ہوگیا کہ جو کچھ راجا صاحب نے برلن میں جرمن گورنمنٹ کو ہندوستان کے موجودہ حالات اور اس کے مستقبل کے متعلق کہا تھا، وہ حقیقت سے دور ہے اور اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ ان کو آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ہستی اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر کوئی کام نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوسکتا۔ وہ اس کے قائل ہوگئے کہ قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم ہندوستان کے موجودہ حالات سے راجا صاحب کی نسبت زیادہ باخبر ہیں اور ان کے خیالات حقیقت کے زیادہ نزدیک ہیں اور ان کو سرحدی علاقوں، افغانستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی اہمیت کے بارے میں زیادہ معلومات ہیں۔ ان وجوہ سے جرمن اور ہندوستانی ممبران مشن کے درمیان وہ اختلاف جو پہلے بعض دوسرے اسباب سے پیدا ہوگئے تھے، اور بھی بڑھ گئے۔

اس مشن کے کابل پہنچنے سے ہماری امیدیں پھر پنپ اٹھی تھیں۔ جو لوگ افغانستان میں انگریزوں کے مخالف تھے، وہ بھی اس مشن کی آمد پر خوش تھے لیکن افغانی حکومت سے جس میں انگریز پرستوں کا زور تھا، یہ مشن اپنی تجویزیں نہ منوا سکا۔ امیر حبیب اللہ خان ایک طرف اس مشن کے ساتھ اور دوسری طرف انگریزوں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ ایک طرف تو اس مشن کو کہتے رہے کہ اگر ترک اور جرمن افواج افغانی سرحد تک پہنچ جائیں تو وہ فوراً انگریزوں کے برخلاف اعلانِ جنگ کردیں گے اور دوسری طرف انگریزی حکومت کو، مشن سے جو بات چیت ہوتی تھی، اس کی خبر دیتے تھے۔ اس مشن نے لاسلکی کے ذریعہ کچھ اپنی حکومت سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کو امیر کی تجویزوں سے خبردار کرے لیکن اس کے ذرائع خبر رسانی اتنے ترقی یافتہ اور کارگر نہ تھے کہ کابل سے برلن یا کابل سے استانبول تک خبر رسانی کرسکے۔ انگریز امیر صاحب کو ان کی ایسی خدمت کی وجہ سے بہت روپیہ دیتے اور جنگ کے خاتمہ پر ان کے لئے ایک بہت گراں بہار رقم کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے امیر صاحب سرحدی قبائل میں جو انگریزوں کے خلاف ہمیشہ دانت پیستے رہے تھے، یہ پروپیگنڈہ کرواتے رہے کہ جہاد کے لئے ایک امیر اور ایک مسلمان اولوا الامر کی ضرورت ہے ورنہ انگریزوں کے برخلاف جو لڑائی لڑی جائے گی، وہ ایک دنیوی جنگ ہوگی اور جہاد شمار نہ کی جائے گی اور ایسی لڑائی میں مرنے والے مسلمان شہیدوں کا درجہ حاصل نہ کرسکیں گے۔ امیر صاحب کے اس قسم کے پراپیگنڈے کا اثر بہت ہوا اور ساری جنگ عظیم اول کے درمیان قبائل سرحد نے انگریزوں کے برخلاف کوئی کارروائی نہ کی، کیونکہ ہمیشہ یہی کہا جاتا تھا کہ جب جہاد کے لئے مناسب وقت آئے گا تو امیر صاحب خود جہاد کا اعلان کرکے ان کی قیادت کریں گے۔

ترکی اور جرمن فوجوں کا رخ ہندوستان کی طرف پھیرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں، وہ بھی چنداں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس مقصد کے لئے ایک ترکی فوجی دستہ ایران کے راستے افغانستان کو روانہ ہوا۔ اس مہم کے سردار رؤف بے تھے جن کے کارنامے جنگ بلقان کے زمانے میں حمیدیہ کروزر (Hamidiyacruiser) کے یونانی بیڑے پر جان نثارانہ حملوں کی وجہ سے ہر کہ ومہ کو ورد زبان تھے، لیکن افسوس ہے کہ یہ مہم ناکام رہی اور ایران میں انگریزی اور روسی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ دستہ افغانی سرحد کی طرف نہ بڑھ سکا اور اس کو ترکی واپس جانا پڑا۔ اس ناکامی کی وجہ سے مشن کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور مشن کے جرمن ممبر 1916ء کے شروع میں کابل سے چلے گئے۔

حکومت موقتہ ہند

راجا صاحب نے ''حکومت موقتہ ہند'' (عارضی حکومتِ ہند) کے نام سے ایک حکومت قائم کی تھی جس کے وہ لائف پریزیڈنٹ یعنی مدت العمر کے لئے رئیس تھے اور مولانا برکت اللہ صاحب اس کے وزیراعظم تھے۔ اس حکومت میں بعض جرمن اور ترک ممبر بھی شامل تھے، مگر اس حکومت کے روحِ رواں صرف راجا صاحب ہی تھے اور وہ جو چاہتے تھے، حکومت اسی میں ان کی ہاں میں ہاں ملادیتی تھی۔ مشن جب کابل پہنچا تو ترک اور جرمن ممبران مشن کو معلوم ہوا کہ راجا صاحب نے جو کچھ ہندوستان کے بارے میں ان کی حکومتوں کو برلن اور استانبول میں کہا تھا، حقیقت سے دور تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں راجا صاحب کی کچھ نہ چلتی تھی اور ان کے خیالات کی نسبت قبلہ مولانا عبیداللہ مرحوم کے خیالات اور رائے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اس پر راجا صاحب نے قبلہ مولانا مرحوم کو اس حکومت میں وزیر داخلہ کا عہدہ دے دیا۔ اس حکومت کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی مختلف حکومتوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرکے ان کو انگریزوں کے برخلاف اپنا اتحادی بنایا جائے۔ چنانچہ اس غرض سے روس کو ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

روس میں حکومت موقتہ ہند کا مشن

یہ وفد روس پہنچ کر زار روس کی حکومت سے گفتگو کرے گا اور اس کو سیاسی اور تجارتی رعایات کا وعدہ دے کر اس کو انگریزوں سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرے گا اور روس کو ہندوستان کا دوست بنائے گا۔ اس کام کے لئے راجا صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا انتخاب کیا۔ متھرا سنگھ ایک زمانے میں امریکا میں غدر پارٹی کا ممبر بن گیا تھا اور ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے لئے ''گوما گاٹا مارو'' نامی جہاز پر ہندوستان آیا تھا۔ اس کے بعض ساتھی پکڑے گئے تھے لیکن وہ انگریزوں کے ہاتھ سے بچ کر افغانستان پہنچ گیا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ایک مسلمان کو بھی اس کے ساتھ بھیجنا چاہا۔ راجا صاحب پہلے تو اس پر راضی نہ ہوئے لیکن بعد میں افغانی حکومت اور سردار نائب السلطنۃ کے حکم سے اس کو منظور کرلیا گیا مگر اس کو سفر خرچ دینے سے کترا گئے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے پاس اتنے لمبے سفر کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے روپیہ بھلا کہاں تھا؟ وہ تو ساری عمر صرف خدا کے بھروسے پر ہی کام کرتے تھے اور خداوند کریم ہمیشہ ان کے لئے اسباب مہیا کرتا رہا تھا۔ اس وقت اتنے تنگ دست تھے کہ کابل پہنچنے کے چند دنوں بعد وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے گزارے کے لئے اپنے کپڑے بھی بیچنے پر مجبور ہوگئے تھے اور اس وقت شیخ ابراہیم کے مہمان بنے ہوئے تھے۔ اس سفر کے خرچ کے لئے انہوں نے مولوی محمد علی سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑی فراخدلی سے ان کو سو پونڈ دے دیے۔ متھرا سنگھ کے ساتھ جانے کے لئے ہمارے ساتھیوں میں سے شیخ خوشی محمد کو علی مرزا کا فرضی نام دے کر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

راستے میں ان کی خدمت کے لئے ہرنام سنگھ نام کا ایک سکھ اور ایک افغان مقرر کیا گیا۔ اس طرح متھرا سنگھ اور خوشی محمد (عرف محمد علی مرزا) روس کی طرف روانہ ہوئے۔ روسی ترکستان پہنچ کر ان کو ترکستان کے روسی گورنر نے تاشقند میں باریابی دی اور ان سے حکومت موقتہ ہند کا وہ نامہ جو ایک سونے کی پتری پر کھدا ہوا تھا، لیا اور اس کو سینٹ پیٹرسبرگ (St.Petersburg) پایہ تخت روس میں زار کو بھیجا اور جواب کے انتظار میں وفد کو تاشقند میں ٹھرایا۔ جب جواب میں دیر لگی تو اس وفد کو یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ جواب آنے پر ان کو خبر دے دی جائے گی۔ زارروس نے یہ نامہ انگریزوں کو دکھلایا اور ان کو جرمنی سے علیحدہ کرنے کی دھمکی دے کر ان سے فوجی مدد مانگی۔ انگریزوں نے اس خط کا ذکر رولٹ سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں جو کلکتہ میں 1918ء میں سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کی طرف سے شائع ہوئی تھی، صفحہ 78 پر ان الفاظ میں کیا ہے:

> The Provisional Govt despatched letter to both tjhe Governor of Russian Turkistan and the then czar of Russia invititing russia to throw over her alliance with Great Britain and assist in the ovethrow of the British rule in India. These were sined by Mahendra Pratap and subsequently fell in British hands. The letter to the Czar was on a gold plate. A

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

photograph of which has been shown to us.

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''حکومت موقتہ ہند نے روسی ترکستان کے گورنر اور اس زمانے کے زار روس کو خط لکھ کر اس کو برطانیہ عظمیٰ کا ساتھ چھوڑنے کا بلاوا دیا اور ہندوستان سے انگریزی راج کو ختم کرنے کے لئے اس سے مدد مانگی۔ ان چٹھیوں پر راجہ مندر پرتاپ کے دستخط تھے۔ بعد میں انگریزوں کے ہاتھ آئے۔ زار کے نام جو خط تھا وہ ایک سونے کی پتری پر لکھا ہوا تھا۔ اس کا فوٹو ہمیں دکھایا گیا ہے۔''

خوشی محمد (محمد علی مرزا) ایک عقلمند اور درویش نوجوان تھا۔ وہ روسی گورنر ترکستان کی ملاقات اور تاشقند کے حالات اور راستے کے متعلق نوٹ لکھتا رہا جو آخرکار واپسی پر اس کے لیے اور قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا رسوخ بڑھانے میں بہت کام آئے۔

جب وفد کابل واپس آیا تو فوراً متھرا سنگھ کو نائب السلطنۃ کے حضور میں لے گئے۔ انہوں نے جب اس سے سفر کے حالات پوچھے تو ڈاکٹر متھرا سنگھ نے بہت سادہ لوحی سے جواب دیا ''صاحب بخیر رفتیم وبخیر باز آمدیم'' (یعنی حضور ہم خیریت سے گئے اور خیریت سے آگئے)

سردار نائب السلطنۃ نے اس سے چند ایک سوالات اور پوچھے لیکن اس نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کہ: ''بخیر رفتیم وبخیر باز آمدیم'' حاجی عبدالرزاق صاحب جو اس ملاقات کے وقت موجود تھے، بڑے مایوس ہوئے۔ انہوں نے فوراً قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کو خبر بھیج کر خوشی محمد کو نائب السلطنۃ کے حضور میں پیش کیا۔ خوشی محمد نے اپنے مختصر نوٹوں سے راستے کے حالات، اس زمانے کے شہر تاشقند کی حالت اور گورنر سے ملاقات کی تفصیل بہت اطمینان بخش طور پر بیان کی۔ اس سے نائب السلطنۃ بہت خوش ہوئے اور مولانا قبلہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب مرحوم کی رائے کو جو انہوں نے خوشی محمد کو متھرا سنگھ کے ساتھ بھیجنے کے بارے میں ظاہر کی تھی، بہت داد دی۔ اس طرح پر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا رسوخ افغانی سرکاری حلقوں میں اور ترکی اور جرمن ممبران مشن کے نزدیک اور بھی بڑھ گیا۔

میری تعلیم قرآن شریف

جب ہم کوچہ حضرت صاحب شور بازار میں رہتے تھے تو ہمارا وقت بے کاری ہی میں گزرا کرتا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ہمیں قرآن شریف کی تفسیر پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس درس میں میرے ساتھ شیخ عبدالقادر اور شیخ خوشی محمد شریک ہوئے تھے۔ شیخ عبدالقادر اور میں درس کے بعد نوٹ لکھ لیا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد شیخ عبدالقادر کو اس مشن کی وجہ سے جس کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا، کابل سے جانا پڑا، اس لئے ان کا درس ادھورا رہ گیا۔ انہوں نے اپنے نوٹ ''الدین والسیاست فی القرآن'' کے عنوان سے ایک کاپی میں مرتب کیے تھے لیکن افسوس ہے کہ وہ نوٹ ضائع ہوگئے۔ خوشی محمد نے میرے ساتھ اس درس کو چند ماہ اور جاری رکھا لیکن بعد میں اس نے بھی سبق پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے اس کے بعد اور دو سال تک قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے فیض حاصل کیا۔ میں نے اپنے نوٹوں کو ''المذہب والسیاسۃ فی القرآن'' کی سرخی سے لکھا۔ ان درسوں میں جن سورتوں اور سیپاروں کی تفسیر میں نے پڑھی، ان کا انتخاب خود مولانا مرحوم ہی کیا کرتے تھے اور اس انتخاب میں اس وقت کے حالات اور نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے رجحانات کو پیش نظر رکھتے تھے۔ شکر ہے کہ یہ نوٹ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ خدا کرے کہ کبھی ان کو بھی چھپوانا نصیب ہوجائے تاکہ دوسرے نوجوان مسلمان بھی ان سے ایسے ہی مستفیض ہوں جیسا کہ جوانی میں، میں ہوا تھا جبکہ مختلف کتابوں، بدلے ہوئے ماحول اور نئے نئے نظریات کی وجہ سے ایمان میں کچھ تزلزل واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(اس کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا)

انہی دنوں میں مولوی محمد علی قصوری نے یہ تجویز کی کہ میں مکتب حبیبیہ میں ریاضی کا سبق پڑھاؤں اور اس طرح ایک طرف تو افغانی طالب علموں کی تعلیم میں مدد دوں، دوسری طرف خود بھی بیکاری سے نجات پاؤں۔ اس کام کے لئے میرا نام تجویز کرنے کیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے بی اے میں Mathematice A & B Courses کا کورس کیا ہوا تھا اور جماعت میں اول نمبر پر تھا۔ لیکن اس میں غلطی یہ کی گئی کہ حافظ احمد دین ہیڈ ماسٹر مکتبہ حبیبیہ کو اس کی اطلاع نہ کی اور نہ ہی ان سے اس کے لئے منظوری لی گئی، کیونکہ مولوی محمد علی قصوری ان کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ خود کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے۔ انگریزوں کے مخالف اور قوم پرست تھے۔ حالانکہ حافظ احمد دین انگریزی کے دلدادہ شمار ہوتے تھے اور وہ صرف ہندوستان کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس پر حافظ احمد دین نے سردار معین السلطنۃ سے جو محکمہ تعلیم کے انچارج تھے، شکایت کی کہ مولوی محمد علی قصوری کے ساتھ ایک ہندوستانی مہاجر بھی مکتب میں آتا ہے اور ان کے ساتھ ریاضی کے گھنٹے میں کلاس میں موجود رہتا ہے اور مکتب میں ریاضی کا سبق پڑھانا چاہتا ہے۔

جاپان اور ترکی کو مشنوں کی روانگی

ہندوستانی، روسی مشن (یعنی متھرا سنگھ اور محمد علی مرزا کے مشن) کے بعد راجا صاحب نے ایک مشن روس کے راستے جاپان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے تجویز کی کہ ایک مشن ایران کے راستے ترکی بھیجا جائے۔ جاپانی مشن میں شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر متھرا سنگھ شریک ہوں گے اور ترکی مشن میں عبدالباری اور شجاع اللہ شامل ہوں گے۔ ان کے اخراجات کے لئے وون ہنٹنگ (Von Henting) نے جو اپنے مشن کابل کی ناکامی سے بددل ہو کر 1916ء کے شروع میں افغانستان سے روانہ ہونے والا تھا، تین سو پونڈ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو دیے۔ اس رقم میں سے سو پونڈ تو راجا صاحب نے اپنے اور مولانا برکت اللہ صاحب کے کپڑوں کے لئے اور دوسری ضروریات سفر کے لئے لے لیے۔ باقی دو سو پونڈ امانت کے طور پر شیخ محمد ابراہیم کے پاس رکھ دیے گئے۔ شیخ صاحب ان دنوں کوچہ حضرت شور بازار والے گھر سے علیحدہ ہوکر محلہ شہر آرا میں جو ایک زیادہ صحت افزا جگہ ہے، مولوی محمد علی قصوری، مولانا صاحب مرحوم کے بھتیجے عزیز احمد کے ساتھ ایک باغ والے گھر میں رہا کرتے تھے۔ چند روز بعد ایک رات کو اس گھر میں چوری ہوئی اور یہ تمام روپیہ اور شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری کی قیمتی اشیاء چرائی گئیں۔ اس سے ان دو مشنوں کا بھیجنا دشوار ہوگیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو ڈر ہوا کہ اس سے راجا صاحب کہیں اس چوری کی واردات کو روپیہ ہضم کرنے کا بہانہ تصور نہ کریں، اس لئے باوجود اس کے کہ پولیس کی رپورٹ سے اس چوری کے سچ مچ واقع ہونے کی تائید اور تصدیق ہوگئی تھی، پھر بھی قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے راجا صاحب کو روپیہ ضائع ہونے کی خبر نہ دی اور مولوی عبدالرحیم عرف مولوی محمد بشیر صاحب سے، جو اس وقت کابل میں جماعت مجاہدین کے نمائندے کے طور پر آئے ہوئے تھے، سو پونڈ قرض لیے۔ یہ روپیا ان کو تین سال بعد محمد علی مرزا کی طرف سے ادا لیا گیا۔ (اس کا ذکر آئندہ مفصل آئے گا) اس رقم کے علاوہ سو پونڈ سردار نائب السلطنۃ سے حاصل کیے گئے اور اس طرح یہ دونوں مشن روانہ کردیے گئے، لیکن افسوس کہ دونوں مشن ناکام رہے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ روسیوں نے متھرا سنگھ اور شیخ عبدالقادر کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کردیا۔ متھرا سنگھ چونکہ اس سے پہلے ایک بم کیس کی وجہ سے پھانسی کی سزا پاچکا تھا اور انگریزوں کے ہاتھ سے بچ کر کابل آگیا تھا، اب ان کے قبضے میں آنے پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ شیخ عبدالقادر مرحوم جنگ کے خاتمے تک نظر بند رہے اور غالباً انہوں نے جیل ہی میں وفات پائی۔ دوسرا مشن مشہد میں روسیوں کے ہاتھ پڑا۔ انہوں نے عبدالباری اور شجاع اللہ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت اذیتیں دیں اور اس کے بعد ان کو انگریزوں کے حوالے کردیا۔ انہوں نے انگریزوں کے ہاتھوں بھی بڑی سختیاں جھیلیں۔ آخر ان کو ہندوستان لے جایا گیا۔

انگریزوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی کابل کی سیاسی کارروائیوں کے متعلق اس طرح واقفیت حاصل کرنے پر افغانی گورنمنٹ سے احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری کو مکتب حبیبیہ کی ملازمت سے برطرف کردیا گیا اور ان کو کابل چھوڑنے کا حکم دے دیا جس کی وجہ سے اس کی تعلیم رک گئی اور اس کی ساری زندگی بیکار گئی، حالانکہ وہ لیاقت اور محنت کشی میں اپنے افغان ہم جماعتوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ وہ لوگ تو تعلیم پاکر آج اپنی حکومت میں قونصل جنرل، سفیر اور وزیر بنے ہوئے ہیں اور عزیز احمد جیسا جان نثار، ہونہار اور محنتی نوجوان نئی تعلیم نہ پانے کی وجہ سے بے کاری میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگیا۔

شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی نے اس کے بعد یاغستان (علاقہ سرحد آزاد) میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں جاکر مولوی محمد علی قصوری تو اس قسم کی سخت اور کٹھن زندگی کو برداشت نہ کرسکے اس لئے ہندوستان چلے گئے۔ شیخ محمد ابراہیم نے فیصلہ کیا کہ سرحد سے قطغن اور بدخشاں کے راستے روس جائیں۔ ان کے ساتھ حاجی ترنگزائی صاحب کا ایک مرید فضل محمود تھا۔ ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ راستے میں شیخ صاحب ٹائیفائیڈ کی وجہ سے فوت ہوگئے، لیکن یہ شبہ بھی موجود ہے کہ راستے میں ان کو انگریزوں کے آدمیوں نے مار ڈالا۔

اس زمانے میں مولوی بشیر صاحب کابل سے رخصت ہورہے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے قبلہ مولانا صاحب کو کہا تاکہ اسمس کی جماعت مجاہدین میں ایک تازہ اور نئی روح پھونکیں، لیکن افسوس ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ان دونوں نوجوانوں کو وہاں بھیجنے کے باوجود بھی وہ لکیر کے فقیر لوگ ایسے دقیانوسی خیالات کے ثابت ہوئے کہ عبدالرشید تو ان کے رئیس نعمت اللہ کی منافقت سے تنگ آ گیا۔ اس کو شبہ ہوا کہ نعمت اللہ انگریزوں سے مل گیا ہے، اس لئے اس نے ایک روز شام کو نعمت اللہ کو قتل کردیا۔ اس کے محافظوں نے عبدالرشید کو زخمی کردیا اور ابھی وہ جان ہی توڑ رہا تھا کہ اس کو تنور میں ڈال کر جلا دیا۔ مولوی محمد بشیر صاحب نے مولوی فضل الٰہی کے اسمس میں ہجرت کرکے آنے پر چرکنڈ میں جو افغانی سرحد کے نزدیک علاقہ مہمند میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جماعت مجاہدین کا ایک دوسرا مرکز بنایا اور یہاں سے کچھ مدت محمد حسن یعقوب کی مدد سے سائیکلو اسٹائل سے چھپا ہوا انگریزوں کا مخالف ایک ماہوار پرچہ بھی نکالا اور بعد میں وزیرستان کے علاقے میں محمد حسن یعقوب کی سرکردگی میں ایک مجاہدین کی ٹولی بنائی اور اس طرح انگریزوں کے برخلاف لوگوں کو اُکسانے کی کوششیں کیں لیکن یہ سب جدوجہد بے مائیگی کی وجہ سے ناکام رہی۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی حجاز روانگی

جن دنوں قبلہ مولانا صاحب مرحوم جاپان اور ترکی کو مشن بھیجنے میں مصروف تھے، مولوی محمد میاں انصاری عرف منصور انصاری جو دیوبند سے حضرت شیخ الہند قبلہ مولانا محمود الحسن صاحب کے ساتھ ہجرت کرکے 18 ستمبر 1915ء کو حجاز چلے گئے تھے، حجاز کے ترکی کمانڈر غالب پاشا کی چٹھی لے کر جس کو ''غالب نامہ'' کہا جاتا تھا اور جو حضرت شیخ الہند مرحوم کی تجویز پر مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے لکھی گئی تھی، ہندوستان اور وہاں سے کابل پہنچے تھے۔ حضرت شیخ الہند اپنے زمانے میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کے روح رواں تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے تعلیم یافتہ لیڈر مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ سے متحدہ کارروائی کے بارے میں سمجھوتہ کرکے بڑی دور اندیشی اور دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ ان کا نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے سمجھوتا کرنا، ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک آزادی میں ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی اہمیت رکھتا ہے جیسی کہ سرسید احمد خان مرحوم کی دور اندیشی رکھتی ہے، جنہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈال کر ہندوستانی مسلمانوں میں نئی تعلیم کو رواج دیا اور ان کو اس ہولناک قعر ذلت سے بچایا جس کے کنارے پر وہ 1957ء کی جنگ آزادی ہند کی ناکامی کی وجہ سے ہندوستان سے اسلامی سلطنت کے مٹنے کے بعد پہنچ چکے تھے۔ حضرت شیخ الہند مرحوم مکہ معظمہ میں غالب پاشا سے ملے اور ان سے غالب نامہ لکھوا کر اس کو مولوی محمد میاں انصاری کو دیا کہ اس کو ہندوستان لے جائیں۔ انہوں نے یہ خط ایک آئینے کے ڈھکنے کے پیچھے چھپا کر اپنی بیوی کو دے دیا۔ وہ چونکہ پردہ پوش تھیں، ان کی بندرگاہ پر ہندوستان میں تلاشی نہ لی گئی اور یہ چٹھی حفاظت سے ہندوستان پہنچی۔ وہاں اس کو لیڈروں اور سرکردوں کو دکھلایا گیا اور پھر کابل لایا گیا۔

جنود اللہ کی تشکیل

قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے قیام کابل کے زمانے کا وہ حصہ جو انہوں نے کوچہ حضرت واقع شور بازار والے گھر میں رہ کر گزارا تھا، غالباً ان کی افغانستان میں بسر کردہ زندگی کا سب سے زیادہ ثمردار حصہ تھا۔ انہوں نے اسی گلی میں رہتے ہوئے "جنود اللہ" کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان لیڈروں اور کارکنوں کو کرسچین سالویشن آرمی (Christion salcation Army) کی طرح ایک نیم فوجی نظام میں منسلک کر کے ان کو عالم اسلام کی بہبودی کے لئے اعزازی طور پر اور بلاتنخواہ کام کرنے والے رضاکاروں کی حیثیت سے کام پر لگایا جائے۔ اس تنظیم کے سالار اعظم قبلہ مولانا الحمود الحسن شیخ الہند مرحوم تھے۔ دوسرے لیڈر حسب مراتب جنرل، لیفٹیننٹ جنرل، میجر جنرل، بریگیڈیئر، کرنل لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر رکھتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی اس میں مختلف عہدے دیے گئے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم ہم میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ ہدایات دیتے اور نصیحت کیا کرتے تھے اور ہر ایک کو آئندہ اسلامی ممالک کی اقتصادیات اور مالی حالت کو درست کرنے کے لئے کس طرح اور کہاں کہاں کام کرنا چاہیے؟ اس کے بارے میں راستہ بتایا کرتے تھے۔

ان منصوبوں کا تعلق ایران، ترکی اور عرب سے تھا۔ مثلاً مجھے اور محمد حسن یعقوب کو یہ کام اپنے ذمے لینے پر تیار کر رہے تھے کہ ہم حجاز جا کر آہستہ آہستہ ایک ایسی تنظیم (Organisation) بنائیں جو حج کے موقع پر ذبح شدہ بھیڑ اور بکریوں اور اونٹوں کی کھالوں کو جمع کر کے ان سے دباغت خانہ (Tannery) میں مختلف قسم کے چمڑے بنائے اور ان کو اسلامی ممالک کو برآمد کرے۔ اس کے لئے حجاز میں بین الاسلامی کمپنی قائم کی جائے جو کھالوں کو صاف کر کے ان سے چمڑا بنائے۔ اسی کام کے لئے مالی ذرائع بہم پہنچانے والے ایک بین الاسلامی بینک کی بنیاد ڈالی جائے جو ان کاموں کے لئے سرمایہ بہم پہنچائے۔ آہستہ آہستہ یہ کمپنی اتنی بڑھ جائے کہ چمڑے کی مصنوعات بنانا شروع کردے اور ان کو برآمد کرنے کے لئے رفتہ رفتہ خود اپنے تجارتی جہازوں سے کام لینے لگے۔ اس کام کی ابتدا ہم حجاز جا کر، وہاں آنے والے حاجیوں سے مل کر اور ان کو یہ منصوبہ سمجھا کر ان کا تعاون حاصل کر کے سرانجام دینے والے تھے۔ یہ منصوبہ اتنا عظیم الشان تھا اور اس کے لئے اتنی ہمت اور جانفشانی کی ضرورت تھی کہ ہم دونوں خود کو اس بار کے اٹھانے کے لئے کافی تنومند نہ سمجھتے تھے۔ لیکن قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی تلقینات اور ہدایات نے ہمیں ایسی جرأت دلادی تھی کہ اگر افغانی گورنمنٹ ہم کو اس وقت اجازت دے دیتی تو افغانستان سے حجاز کو خشکی کے راستہ روانہ ہوجاتے تاکہ اس کارِ خیر کو شروع کرنے کے لئے مسلمان مالداروں کو آمادہ کریں۔

میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی ایسے ہی مختلف منصوبے بتائے گئے تھے لیکن چونکہ ہر ایک کا کام دوسروں سے بالکل خفیہ رکھا جاتا تھا، اس لئے ہم ایک دوسرے کے منصوبے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے واقف نہ ہوتے تھے، مگر افسوس ہے کہ زمانہ سازگار نہ ہوسکا۔ چند ماہ بعد جب ترکی جرمن مشن کی ناکامی پر راجا مہندر پرتاب افغانستان سے چلے گئے تو افغانی حکومت نے ہم پر اور سخت پابندیاں لگا کر ہم کو پھر نظر بندی میں ڈال دیا اور ہم کو لوگوں سے ملنے جلنے سے منع کردیا۔ عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب، جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، یاغستان میں جماعت مجاہدین میں چلے گئے اور ہم باقی لوگ کابل میں نظر بند کردیے گئے۔ راجا مہندر پرتاب نے کابل سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے بھائی، جو سوئیزر لینڈ میں تھا، ہندوستان کے راستے خط و کتابت کرنی چاہی اور اس کے لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے مدد مانگی۔ اس پر قبلہ مولانا مرحوم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو جو ہندوستان سے براہ قندھار ان کے ساتھ کابل آیا تھا، اس کام پر مقرر کیا۔ وہ راجا صاحب کے خطوط لے کر خفیہ طور پر ہندوستان گیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے اور اپنی جان پر کھیل کر یہ خطوط ان کے گھر واقع ہاترس (بنارس) پہنچا دیے اور وہاں سے ان کی رسید لے کر واپس کابل آ گیا، لیکن راجا صاحب اس وقت کابل چھوڑ چکے تھے۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ان کو شہر مزار شریف واقع شمالی افغانستان میں یہ اطلاع بھیج دی کہ ان کے خطوط خیریت سے منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

ریشمی چٹھی

انھی دنوں قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنی کابل کی کارروائیوں کی اطلاع حضرت شیخ الہند کو دینا چاہی۔ یہ سب خبریں اور رپورٹیں ریشمی کپڑے پر لکھی گئیں اور ۸ رمضان (9 جولائی 1916ء) کو ان کے ہندوستان لے جانے کے لئے اور شیخ عبدالرحیم صاحب حیدرآبادی کو سندھ میں دینے کے لئے ہمارے ساتھیوں میں سے اللہ نواز خان کے باپ رب نواز خان کا پروردہ شیخ عبدالحق نام ایک نومسلم منتخب کیا گیا۔ یہ رپورٹ کسی معتبر حاجی کے ذریعہ شیخ عبدالرحیم صاحب کی طرف سے حجاز میں حضرت شیخ الہند کو بھیجی جانے والی تھی۔ اگر اس کام کے لیے کوئی قابلِ اعتماد حاجی نہ مل سکے تو خود شیخ عبدالرحیم کو حجاز جانے کے لئے کہا گیا تھا۔

عبدالحق سندھ جاتا ہوا، اپنے گھر جانے کے لئے ملتان میں ریل سے اترا اور اللہ نواز خان کے والد خان بہادر رب نواز خان سے ملا۔ اس نے عبدالحق سے ضرور اس کے آنے کا سبب پوچھا ہوگا جس پر اس نے یہ چٹھیاں اس کو دے دی ہوں گی۔ رب نواز کے ہاتھ یہ چٹھیاں آتے ہی اس نے اپنی گورنمنٹ پرستی کا ثبوت دینے کے لئے یہ خطوط گورنمنٹ کو دے دیے، جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی بہت گرفتاریاں ہوئیں اور یہ منصوبہ خاک میں مل گیا۔ عبدالحق کو اس کے صلے میں پولیس میں نوکری ملی اور خان بہادر کو مربعے دے دیے گئے۔ یہ بات ابھی تک پوری طرح ثابت نہ ہوسکی تھی کہ عبدالحق ہمارے ساتھ شروع ہی سے انگریزی جاسوس کے طور پر آیا تھا یا اس کو رب نواز نے ہندوستان آنے پر ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر ورغلایا تھا۔ رولٹ رپورٹ (Rowlatt Report) میں اس ریشمی چٹھی والی سازش کا ذکر صفحہ 178 پر آتا ہے۔ عبدالحق کے ہمارے ساتھ ایک انگریزی جاسوس کے طور پر آنے کے بارے میں ہمارے ہاتھ میں کوئی قطعی اور مکمل دلیل موجود نہیں لیکن اس قسم کا شبہ ضرور موجود ہے کہ کابل آنے کے بعد اللہ نواز خاں کا بھائی شاہ نواز کبھی کبھار سیر پر جاتے ہوئے افغانی پہرہ دار کو رشوت وغیرہ دے کر اپنے سے دور کرنے کے بعد انگریزی قونصل خانے کے عملے سے خفیہ طور پر ملا کرتا تھا۔ اس کا علم اللہ نواز کو قطعی طور پر تھا یا نہیں؟ ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ عبدالحق کے کابل سے روانہ ہونے کے وقت اللہ نواز اور شاہ نواز نے اس کو کہا ہو کہ سندھ جاتا ہوا ملتان سے گزرے اور ان کے والد سے ملے۔ یہ ملاقات صرف ہجراں دیدہ رشتہ داروں کی تسلی کے لئے تھی یا حقیقتاً اس کا مقصد ریشمی چٹھی کو رب نواز تک پہنچانے یا اس چٹھی کے اس تک پہنچنے کے لئے راستہ صاف کرنا تھا، یہاں اس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یقینی طور پر نہیں لکھا جاسکتا۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے عبدالحق کو اپنے گھر، صرف اپنی خیریت بہم پہنچانے کے لئے بھیجا ہو۔ یہ ان کے لئے ایک قدرتی حرکت تھی اور طبیعتِ بشری کا تقاضا بھی تھا۔ شاید وہاں جاکر اور رب نواز سے ملنے پر عبدالحق نے کابل کے حالات اس کو بتا دیئے ہوں اور اس نے اس سے ہندوستان آنے کا اصل مقصد پوچھا ہو اور لالچ یا دھمکی دے کر اس سے یہ راز معلوم کرلیا ہو۔ گمان ایسا ہے کہ شاہ نواز ضرور انگریزی قونصل خانہ کے عملے سے مل گیا تھا۔ چنانچہ وہ جب ایک سال کے بعد پاکستان کے راستے ہندوستان واپس چلا گیا تو اس کو نہ انگریزوں نے نظربند کیا، نہ ہی کوئی اور سزا دی بلکہ اس کو محکمہ ریلوے میں ایک ملازمت دے دی۔ اللہ نواز خان بھی سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کے کابل کا بادشاہ بننے پر ہندوستان کے راستے آزادی سے یورپ آنے جانے لگ گیا تھا۔ غالباً اس کے باپ کی انگریز پرستی کے صلہ میں اس کو یہ آسانیاں مل گئی تھیں۔

ہماری دوسری نظربندی

راجہ مہندر پرتاب کے کابل سے چلے جانے پر ان کا مشن بالکل ختم ہوگیا۔ اس کے بعد افغانی گورنمنٹ نے ہم پر جو پابندیاں لگائیں، ان کے سلسلہ میں یہ بھی کیا کہ ہم کو کوچہ حضرت شور بازار والے گھر سے نکال کر شہر سے باہر باغ بالا کے نزدیک ناظر محمد صفر نام گورنر قطغن بدخشاں کے قلعہ چہ (چھوٹے قلعے کی مانند گھر) میں نظر بند کردیا، جہاں سے کسی اپنے پرائے شخص کا بھی گزر نہ ہوسکتا تھا۔ وہاں تک پہنچ کر کسی کا ہم سے ملنا تو بالکل ہی خارج از امکان تھا۔ ناظر محمد صفر سردار نصراللہ خان نائب السلطنۃ کا قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ اس کا لڑکا محمد اختر "امین الاطلاعات" کا عہدہ رکھتا تھا۔ یعنی سردار نائب السلطنۃ کی C.I.D کا ہیڈ (Head) تھا۔ اس قلعہ چہ کے برج میں سب سے اوپر کی منزل کا کمرہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو دیا گیا تھا۔ نیچے کی منزل کے کمروں میں ہم لاہوری طلبا رہا کرتے تھے۔ پشاوری اور کوہاٹی مہاجر ہم سے جدا کردیئے گئے تھے۔ اس گھر سے ہمارے فرار کو روکنے کے لئے افغانی سپاہیوں نے ہر طرح کی تدبیریں سوچیں۔ یہ گھر انگوروں کے باغ کے اندر تھا اور باغ اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ گھر کے دروازے تک پہنچنے کے لئے ایک ٹیلے پر چڑھنا پڑتا تھا۔ کھڑکیاں بھی زمین سے بہت اونچی تھیں۔ دروازے پر ہمیشہ سنتری کھڑا رہتا تھا۔ اس لئے یہاں سے بھاگنا سخت مشکل تھا۔ اس کے باوجود بھی افغانی سپاہی گھر کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کو دکھلا کر اور "اگر کیفیت ازیں سو آمد چہ میکنیم" (یعنی فرار کا واقعہ اس طرح سے ہوا تو ہم کیا کریں گے؟) کہہ کر ایک دوسرے کو چوکنا رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

اس گھر میں رہتے ہوئے میں اور خوشی محمد زیادہ تر قبلہ صاحب مرحوم کے لئے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کرنے میں یا اس کا خلاصہ ان کو سنانے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کتاب انگلستان کے قانون اساسی یا آئین Constitution کے بارے میں تھی۔ قبلہ صاحب مرحوم ہندوستان کے مستقبل طرزِ حکومت کے بارے میں جو کچھ تصورات رکھتے تھے، ان کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انگریزی حکومتِ نظام اور پارلیمینٹری ادارے کے بارے میں پوری واقفیت پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کو امید تھی کہ ایک روز حکومت موقتہ ہند کی تجویز کے مطابق ہندوستان افغانستان کی مدد سے آزاد ہوجائے گا اور دہلی میں ایک افغانی شہزادہ (قانونی بادشاہ Constitution monarch) کے طور پر حکمران ہوگا اور اس کی حکومت انگریزی گورنمنٹ کی طرح ایک آئینی حکومت ہوگی۔ حکومت موقتہ ہند کی ایک شاخ (Branch) ماورا سندھ trans......Indus ہوگی جس کے ماتحت صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، سرحد، آزاد ہندوکش تک کا علاقہ ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میری معلمی کی ابتدا

اس گھر میں رہتے ہوئے میری معلمی کا دور شروع ہوا۔ محمد اختر نے اپنے دفتر کے ایک نوجوان کلرک کے ساتھ جس کا نام میر غلام محمد تھا اور جو بعد میں افغانی سفارت متعینہ پیرس کا سیکریٹری بنا اور جس نے غبار کا تخلص لے کر افغانستان میں فارسی شاعری میں اچھی خاصی شہرت حاصل کی، مجھ سے انگریزی پڑھنا شروع کی۔

چونکہ میرا گھر اس کے دفتر سے بہت دور تھا، اس لئے محمد اختر میری سواری کے لئے ہفتہ میں تین دن اپنا گھوڑا سائیس کے ہاتھ بھیجا کرتا تھا۔ انگریزی سبقوں کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ محمد اختر اور اس کے کلرک دونوں کی تعلیم بہت کم ہے۔ یہاں تک کہ وہ فارسی کی گرامر (صرف و نحو) سے بھی واقف نہیں ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ ''اندھوں میں کانا راجا'' اس زمانے میں افغانستان کے باشندے اور ان کا حکمران طبقہ اس ضرب المثل کا مصداق تھا۔ لوگ ان پڑھ اور پس ماندہ تھے۔ اس وقت جس کو ذرا لکھنا پڑھنا آتا تھا، وہی برسرکار ہوجاتا تھا۔

حکومت میں نالائق آدمی بھی داخل تھے اور کوئی نہ پوچھتا تھا کہ کس قابلیت کی بنیاد پر وہ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے ہیں؟ موجودہ افغانستان میں بھی گریجویٹ اور ڈگری (Degree) یافتہ اعلیٰ افسر ابھی تک بہت کم ہیں۔

1916-17ء کی سردی کے دنوں میں ہمیں پھر شہر میں منتقل کردیا گیا اور ایک چھوٹا سا گھر ہماری رہائش کے لئے مقرر ہوا جس میں پشاوری اور کوہاٹی مہاجر بھی آگئے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے ہم پر ایسی تہمت لگائی گئی کہ اگر خدا کا فضل ہمارے ساتھ نہ ہوتا اور سردار سپہ سالار محمد نادر خان ہماری مدد نہ کرتے تو ہم سب افغانی قید خانے میں پڑ جاتے اور شاید وہیں مر جاتے۔ ہم سے پہلے مولوی عبدالغنی اور ان کے بھائی چراغ دین، مولوی محمد حسین علیگ اور ان کے ساتھی ایک معمولی الزام میں سال ہا سال قید میں رہے تھے۔ تہمت کا واقعہ اس طرح ہوا کہ ہمارے ساتھیوں میں سے عبداللہ کا بھائی عبدالرحمن، جو ہمارے بعد ہندوستان سے نکل کر ہمارے پاس پہنچا تھا اور ایک عجیب طبیعت کا لڑکا تھا، اس کی قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے بھتیجے محمد علی سے نہیں بنتی تھی۔ ایک روز محمد علی پر ہماری طرح پہرہ نہیں تھا اور آزادی سے گلی اور بازار میں آ جا سکتا تھا، شاہی محل (ارگ) کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس کو اجنبی سمجھ کر ایک سپاہی نے پکڑا اور اس کو کوتوالی لے گیا۔ وہاں اس نے اپنے بیانات میں بتایا کہ وہ قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم کا بھتیجا ہے۔ اس پر اس کو اس وقت چھوڑ دیا گیا لیکن بعد میں وہ بھی ہماری طرح نظربندی میں رکھ دیا گیا۔ اس پر عبدالرحمن نے ایک عرضی لکھ کر سردار محمد نادر خان مرحوم کے دربار میں پیش کی جس میں لکھا کہ محمد علی امیر حبیب اللہ خان کو مارنے کے لئے ''ارگ'' کے نزدیک پھرنے گیا تھا اور باقی لاہوری مہاجر بھی اس کے شریکِ جرم ہیں۔ اس پر ہم کو سردار محمد نادر خان مرحوم کے دربار میں حاضر ہونا پڑا۔

اس زمانے میں افغانی شہزادوں کے سوا جن کو عدالتی اختیار حاصل تھے۔ سردار محمد نادر خان مرحوم کو بھی دربار کرنے اور فوجی معاملات کے علاوہ بعض جرائم کے مقدمے سننے کے اختیارات ملے ہوئے تھے۔ ایک دو پیشیوں میں تو ہمارے مقدمے کی سماعت نہ ہوسکی۔ آخر تیسری پیشی میں دوپہر کے نزدیک اس کی عرضی کے پڑھے جانے کی نوبت آئی تو سردار محمد نادر خان مرحوم نے حکم دیا کہ دوپہر کے کھانے بعد اس مقدمے پر غور کیا جائے گا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ان پیشیوں میں ہمارے ساتھ دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس روز دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے دربار ہی نہ کیا اور اس عرضی کو کھتائی میں ڈال دیا اور بعد میں اس کو پھڑوا دیا۔ ان کے اس احسان کو ہم ساری عمر نہیں بھول سکتے۔ کیونکہ اگر اس عرضی پر کوئی کارروائی کی جاتی یا اس کو وہ امیر صاحب کے دربار میں بھیج دیتے تو ضرور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا کہ ہم کو کم از کم عمر قید کی سزا تو ضرور مل جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ عبدالرحمٰن نے یہ عرضی سردار معین السلطنۃ یا سردار نائب السلطنۃ یا سردار عین الدولہ کے دربار میں نہ دی تھی۔ وہ اگر ایسا کرتا تو ہماری جانوں کا بچنا سخت مشکل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان شہزادوں کے دربار میں آسانی سے نہیں پہنچ سکا یا اس کے سپاہی نے جو اس کو بازار لے گیا، اس کو کہا کہ سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کو اپنی عرضی دے جو اس کو امیر حبیب اللہ خان کے دربار میں بھیج دیں گے۔

ہم اس گھر میں رہتے تھے کہ جون 1917ء میں سید علی عباس بخاری پشاور سے ہجرت کر کے کابل پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ پشاور میں انگریزوں سے مخالفت کرنے کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں اپنے قوم پرست جذبات کے سبب سے قابلِ قدر ہستی مانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا محمد علی جوہر سے ان کا تعلق تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے وہ دہلی میں ملے تھے۔ کابل آنے پر امیر حبیب اللہ نے ان کو نظربند کر دیا۔ ان کی نظربندی ہماری نظربندی کی نسبت بہت سخت تھی۔ وہ بالکل اکیلے گھر میں رہتے تھے اور ان کو بازار جانے کی بھی اجازت نہ تھی اور نہ کوئی ان کے گھر جا کر ان سے مل سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر افغانستان نے انگریزوں کے اشارے پر ان کو اتنی سخت نظربندی میں ڈالا تھا۔ ہم نے ایک دو دفعہ اپنے پہرہ داروں کو رشوت دے کر اور ان کے مہمان دار مرزا کو پھسلا کر ان سے ملاقات کی۔ اس قیدِ تنہائی کی وجہ سے ان کے حواس مختل ہونے لگے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ایک دفعہ ان سے ملنے میں کامیاب ہوگئے تھے، جس سے ان کو بہت تسلی ہوئی تھی۔ وہ بہت ایماندار، اسلام کے دردمند شیدا تھے اور ایک حساس شخصیت رکھتے تھے۔ عالمِ اسلام کی حالت اور ترکی جنگ کی رفتار سے ان کو بہت صدمہ ہوتا تھا۔ ان جیسی قابلِ قدر ہستی کا اس طرح مخبوط الحواس ہو کر بے کار ہونے کا گناہ امیر حبیب اللہ خان کی گردن پر رہے گا۔

اس گھر میں گرمی کے دنوں میں رہنا سخت دشوار تھا، اس لئے سپہ سالار سردار محمد نادر خان مرحوم نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے اپنی عقیدت کی وجہ سے ہم سب کے لئے شہر کے باہر درختوں کے نیچے ایک باغ میں، جو چڑیا گھر کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور جہاں پنجروں کے اندر ایک ببر شیر اور چند ایک درندے رہتے تھے، 1917ء میں خیمے لگوا دیئے۔ ہم یہاں چند ایک مہینے رہے۔ اس عرصے میں بقرعید بھی آئی اور سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم، قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے ملنے اور عید مبارکی دینے کے لئے آئے۔ اس ملاقات کے دوران میں انہوں نے شیر ببر کی طرف اشارہ کر کے قبلہ مولانا مرحوم کو کہا: ''اس باغ میں دو شیر رہتے ہیں۔''

یہاں قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو ایک خیمہ ملا ہوا تھا اور ہم لوگوں میں سے دو دو آدمی ایک خیمہ میں رہتے تھے۔ میں خوشی محمد کے ساتھ ایک ہی خیمہ میں سویا کرتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے خوشی محمد کا وہ روپیہ جو اس کو ہماری مشترک پونجی کے آپس میں مساوی طور پر تقسیم کے بعد اس کو ملا ہوا تھا، ختم ہوگیا تھا۔ میں نے چونکہ اپنے حصے کو ذرا احتیاط سے صرف کیا تھا اس لئے میرے پاس کچھ چھوٹی سی رقم موجود تھی۔ خوشی محمد کو اپنی بے مائیگی کی وجہ سے ذرا مایوسی ہوئی، اس لئے میں نے اس سے کہا کہ ''جو کچھ میرے پاس ہے وہ اب ہمارا مشترک مال ہوگا اور ہم اس کو مل کر خرچ کریں گے۔'' اس پر وہ بہت خوش ہوا اور اس کی ڈھارس بندھ گئی۔

اللہ نواز کی قید

ہماری یہاں کی رہائش کے زمانے میں دو افسوسناک واقعات ہوئے۔ ان میں سے ایک واقعہ کی وجہ سے ہم سب کی بہت بے عزتی ہوئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک روز دوپہر سے پہلے اللہ نواز نے بازار جانا چاہا۔ اس نے ایک سپاہی کو اپنے ساتھ بھیجنے کے لئے حوالدار کو کہا۔ حوالدار نے اس کو کچھ گستاخی سے جواب دیا۔ اس پر اللہ نواز نے اس کو پیٹا جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اس کی آنکھ پر زخم آ گیا۔ اس نے فوراً حکومت سے شکایت کی کہ ہندوستانی مہاجروں نے ان کو مارا، حالانکہ وہ ایک افغانی عہدیدار تھا۔ اگلے روز یہ مقدمہ سردار عنایت اللہ خان معین السلطنۃ کی دربار میں پیش ہوا۔ ہم سب کو بحیثیت مجرم کچہری میں بلایا گیا۔ اس واقعہ میں اگر کسی کا قصور تھا تو صرف اللہ نواز کا تھا۔ ہم سب کو خاص کر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو ایک مجرم کی طرح کچہری میں بلانا بالکل بے معنی تھا۔ دوپہر تک ہم نے پیشی کا انتظار کیا۔ آخر ہماری باری آئی اور مقدمہ سنایا گیا۔ سردار محمد نادر خان سپہ سالار مرحوم بحیثیت کمانڈر اعلیٰ فوج افغانستان اس مقدمے کی ساعت کے وقت دربار میں موجود تھے، مگر انہوں نے اپنے سپاہی کی حمایت کی بجائے ہماری طرف داری کی۔ مگر معین السلطنۃ نے ان کو بولنے نہ دیا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت آ پہنچا تھا اس لئے کچہری بند ہوگئی اور ہم وہاں ہی بغیر کھانے پینے کے دوسری پیشی کے انتظار میں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے۔ دوپہر کے بعد پھر دربار لگا تو معین السلطنۃ نے بہت غصے سے کہا: ''در ملک ما مہمان خر صاحب خانہ میبا شد، بہر طوریکہ بخواہد اور امی راند۔ ایں مہمانہا سپاہی مارا زخمی کردہ اند۔ زخمی کہ بر چشم۔ سپاہی ما است بردل ماست ایں آدم را بگیرید و بندی اش بکنید۔'' (یعنی ہمارے ملک میں مہمان کو میزبان کا گدھا مانا جاتا ہے۔ وہ اس کو جس طرح چاہے ہانک سکتا ہے۔ چونکہ اس مہمان نے ہمارے سپاہی کو زخمی کیا ہے۔ ہمارے سپاہی کی آنکھ پر جو زخم لگا ہے وہ ہمارے دل پر لگے ہوئے زخم کی مانند ہے۔ اس آدمی کو پکڑو اور قید میں ڈال دو۔)

اس مقدمے میں ہم میں سے کسی کو بولنے اور مدافعت کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ سارے اسلامی ملکوں میں مہمان کی قدر و منزلت بہت اونچی مانی جاتی ہے لیکن افغانستان میں اس کو صاحب خانہ کا گدھا بنا دیا جاتا ہے۔ ان باتوں اور اس فیصلے کے سننے سے ہم سب بہت رنجیدہ ہوئے۔ اللہ نواز کو یہاں سے سپاہی کابل کے قید خانہ میں، جہاں قاتل، ڈاکو اور چور بھی تھے، لے گئے۔ اس کے دو دن بعد مولانا صاحب مرحوم نے کوتوال شہر کو خط لکھا اور ہم سب نے مل کر ایک عرضی دی اور اللہ نواز کے لئے معافی اور شفاعت چاہی اور وعدہ کیا کہ پھر کبھی ایسی واردات نہ ہوگی۔

اللہ نواز خان چھ روز کی قید کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اگر قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور ہم سب مل کر اس طرح کی عرضی نہ دیتے تو ممکن تھا کہ اللہ نواز خان سالہا سال اسی قید خانہ میں پڑا رہتا، کیونکہ اس زمانے میں افغانستان میں نہ باقاعدہ عدالتیں تھیں نہ باقاعدہ جج تھے کہ ملزموں کا دفاع کریں۔ وہاں اس وقت ایسا اندھیر کھاتا مچا ہوا تھا کہ قیدیوں کی پیشی کی نوبت بڑی مشکل اور دیر سے آتی تھی اور عام طور پر اس کے لئے بڑی بڑی رقمیں بطور رشوت دینی پڑتی تھیں۔ اس افراتفری کے بارے میں ایک مثال دینے کے لئے یہاں ایک واقعہ لکھتا ہوں جو کابل میں اس وقت ایک کہاوت کے طور پر زبان زد عام تھا اور جو اس کی بھی دلیل ہے کہ افغانستان کا حکمران طبقہ، علاقہ ہزارہ جات کے باشندوں کے ساتھ جن کو ''ہزارے'' کہتے ہیں جو مغل نسل کے شیعہ ہیں جو باقی افغان آبادی کی نسبت زیادہ غریب اور عام طور پر مزدور پیشہ ہیں، کیسا برا سلوک کرتا ہے اور ان کو کیوں کر ہر طرح کے حقوق سے محروم رکھتا ہے؟ ہم کو یہ واقعہ اس طرح سنایا گیا تھا:

''ایک دن سات قیدی اسی قید خانے میں امیر صاحب کے دربار میں پیشی کے لئے سپاہیوں کی طرف سے نکالے گئے۔ یہ لوگ شہر کے کوچوں میں سے گزر کر بازار پل چشتی میں آئے۔ یہاں کی بھیڑ بھاڑ سے فائدہ اٹھا کر ایک قیدی نے سپاہیوں کے ہاتھ سے اپنے کو چھڑایا اور بازار کے جم غفیر میں مل کر سپاہیوں کی آنکھ سے اوجھل ہوا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ پل چشتی سے گزرنے کے بعد سپاہیوں نے قیدیوں کا جائزہ لیا تو ان کو معلوم ہوا کہ ایک قیدی کم ہے۔ اس سے وہ بہت پریشان ہوئے کیونکہ ان کو ڈر لگا کہ وہ اس مفرور قیدی کی بجائے قید خانہ میں پڑیں گے۔ اس پر انہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے وہاں کے لوگوں کو گھیر لیا اور قیدیوں کو پھر گننا شروع کیا۔

"یک، دو، سہ، چہار، پنج، شش" (ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ) اور اس کے فوراً بعد ہی گھرے ہوئے آدمیوں میں سے ایک ہزارے کو پکڑا اور قیدیوں کی طرف اس کو دھکیل کر کہا "این ہفت" (یعنی یہ ہے ساتواں) وہ بیچارہ چیختا چلاتا رہا لیکن سپاہیوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کو ہتھکڑی لگا کر کچہری میں پیش کردیا۔

سرحدی علاقوں میں سے گزرتے ہوئے ہم نے سرحدی پٹھانوں کی مہمان نوازی خوب دیکھی تھی، حالانکہ آج افغانی حکومت جو ان کے افغانی قوم کا ایک جزو ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، اس کا اس زمانے کا ایک سردار اور ولی عہد سلطنت معین السلطنہ بڑے فخر سے سر دربار ایک افغانی ضرب المثل کو دہراتا ہے اور مہمان کو میزبان کا گدھا بناتا ہے۔ قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ سرحدی پٹھان اور افغانستان کے حکمران افغان، جب ایسا جدا جدا کریکٹر رکھتے ہوں تو ان کو کیسے ایک قوم کے دو حصے مانا جاسکتا ہے؟

عبداللہ کا فرار

اس چڑیا گھر کے باغ میں رہتے ہوئے ہم پر جو دوسری مصیبت آئی وہ یہ تھی کہ ہمارے ساتھیوں میں سے عبداللہ اور اس کا بھائی عبدالرحمٰن اور اللہ نواز خان کا بھائی شاہ نواز فرار ہوگئے۔ انہوں نے پشتون زبان سیکھ لی تھی اور پہرہ داروں سے اپنا میل جول بہت بڑھا لیا تھا۔ ان کو اتنا یقین دلایا تھا کہ اگر وہ ایک دو گھنٹے باغ سے باہر جاکر درختوں کے نیچے اور کھیتوں میں جاکر بیٹھ جائیں تو سپاہی ان کو کچھ نہ کہتے۔ ان دنوں میں جماعت مجاہدین کا ایک وفد بھی اپنا سالانہ وظیفہ لینے کو کابل آیا ہوا تھا۔ ان تینوں نے ان سے بھی گہرے تعلقات پیدا کئے اور ان کو اس پر راضی کرلیا کہ وہ ان کو اپنے ساتھ یاغستان لے جانے کے لئے افغانستان کی سرحد سے خفیہ طور پر گزار دیں۔ روانگی کے مقررہ دن انہوں نے پہرہ داروں کو کہہ دیا کہ وہ سارا دن باغ سے باہر درختوں کے نیچے رہیں گے۔ سپاہیوں کو تو ان پر بھروسہ تھا ہی، انہوں نے ان کی تلاش نہ کی اور وہ صبح سویرے ہی مجاہدین کے نمائندے کے ساتھ نکل گئے اور سارا دن اور اگلی رات راستہ چلتے رہے۔

جب اگلے دن سپاہیوں نے ان کو باغ میں نہ دیکھا، اس وقت تک وہ جلال آباد کا آدھا راستہ کاٹ چکے تھے۔ جب تک کہ پولیس والے جلال آباد کے حکام کو خبر دیتے، وہ وہاں سے بھی گزر گئے اور جماعت مجاہدین کے مرکز چرکنڈ واقع علاقہ آزاد میں پہنچ گئے۔

اس فرار کی وجہ سے ہم پر اور بھی زیادہ پابندیاں لگ گئیں۔ ہماری نظربندی سخت تر ہوگئی اور ہمیں گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قسم کی فرار کی وارداتوں کا آئندہ سدباب کرنے کے لئے ہم کو پھر شہر میں منتقل کردیا گیا۔

سنہ 18-1917ء کی سردیاں بھی آرہی تھیں اور سردیوں میں ہمارے لئے خیموں میں رہنا بھی ناممکن تھا اس دفعہ ہم کو کوچہ تیلیان میں ایک گھر دیا گیا جہاں ایک زمانے میں حافظ احمد دین ہیڈ ماسٹر حبیبیہ اسکول رہا کرتے تھے۔ یہ گھر تو اچھا تھا لیکن اس کی گلی بڑی تنگ اور گندی تھی۔ اس گھر کے سراچہ (مردانہ حصہ) میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور عزیز احمد رہتے تھے اور اندرونی (زنانہ) حصہ میں ہم اور پشاوری اور کوہاٹی مہاجر جاگزین تھے۔ نیچے کی منزل میں ایک کوٹھڑی میں پہرہ دار اور دروازہ پر ایک سنتری رہا کرتا تھا۔ گلی اور بازار کو جانے پر ایک افغانی سپاہی مثل سابق ہمارے ساتھ جایا کرتا تھا جو ہمیں کسی سے بات کرنے کی اجازت تک نہ دیتا تھا۔ کوچہ حضرت میں بھی بازار جاتے ہوئے ہمارے ساتھ سپاہی ہوا کرتا تھا لیکن اتنی سختی نہ کیا کرتا تھا۔ بلکہ ضرورت کے وقت ہم کو کام میں مدد بھی دیتا تھا۔

اس گھر میں رہتے ہوئے بھی میں نے درسِ قرآن شریف جاری رکھا اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے پڑھائے ہوئے سبقوں کے نوٹ لکھتا رہا۔ اس کے سوا میرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقی وقت دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گزرتا جو عام طور پر شطرنج اور تاش کھیلا کرتے تھے۔

یہاں رہتے ہوئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم نے اپنے بڑے بیٹے محمد طاہر جان کی تعلیم کے لئے ایک شخص مانگا۔ اس پر انہوں نے مجھے اس کام پر متقرر کیا۔ میں ہر روز سپاہی کے ساتھ شام کو ان کے سراچہ کو جاکر اس لڑکے کو جو اپنے ہندوستانی مسلمان اتالیق (لالا) کی نگرانی میں رہتا تھا، مدرسے کے دیئے ہوئے کام میں، خاص کر حساب کے سوالوں کے حل کرنے میں مدد دیا کرتا تھا۔ اس طرح پر میرے تعلقات سردار محمد نادر خان سپہ سالار مرحوم سے اور ان کے خاندان سے بہت بڑھ گئے جس کا اثر میری آئندہ کی زندگی پر بہت زیادہ پڑا۔ اس کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔ انہی تعلقات کی وجہ سے میں نے ایک روز ان سے وعدہ لیا کہ مجھے جب کبھی موقع ملے تو تعلیم پوری کرنے کے لئے یورپ ضرور بھیج دیں گے۔

رحمت علی کا فرار

اس گھر میں رہتے ہوئے ہمارے ساتھیوں میں سے رحمت علی زکریا نے بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ رحمت علی بڑا منچلا نوجوان تھا۔ اس کی طبیعت حالات سے جلد تنگ آجاتی تھی اور وہ اونے ماحول کے برخلاف بغاوت پر آمادہ ہوجاتا تھا۔ اس نے نظربندی سے تنگ آکر ارادہ کرلیا کہ جس طرح ہوسکے کابل سے فرار ہوجائے۔ اس نے قبلہ مولانا صاحب کو اپنے ارادے سے خبردار کیا۔ انہوں نے اس کی ممانعت تو نہ کی لیکن اس فرار کی وجہ سے ان پر جو الزام آسکتا تھا، اس سے بچنے کے لئے انہوں نے حکومتِ افغانستان سے درخواست کی کہ ان کو ہم سے علیحدہ کرکے کسی اور جگہ پر ان کی رہائش کا انتظام کردیا جائے۔ حکومت نے ان کو مستوفی الممالک (یعنی وزیر مالیات) مرزا حسین کے گھر کے سراچہ میں جگہ دے دی۔ ان کے دونوں بھتیجے محمد علی اور عزیز احمد بھی ان کے ساتھ چلے گئے اور وہ وہاں نسبتاً آزادی سے رہنے لگے۔ نومبر 1917ء میں رحمت علی اس کے بعد ایک رات کو ایک چھوٹی سی کھڑکی سے ایک کمند کے ذریعہ گلی میں اترا اور جماعت مجاہدین کے ایک ممبر عبدالرزاق کے ساتھ، جس سے اس نے پہلے ہی اس بارے میں سمجھوتا کیا ہوا تھا، کابل سے بھاگ کر شہر مزار شریف کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ وہاں گورنر سردار محمد یوسف خان سے ملا اور اس کو کہا ''مجھے حاجی عبدالرزاق رئیس محکمہ شرعیہ نے روس بھیجا ہے اور اس لئے میں مزار شریف آیا ہوں کہ روس پہنچوں۔'' اس زمانے میں روس میں بولشویکی انقلاب ہوچکا تھا اور کیمونسٹوں نے زار کو تخت سے اتار کر ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ گورنر نے رحمت علی سے حاجی صاحب کا تعارفی خط مانگا لیکن اس نے جواب دیا کہ ''ایسی خفیہ کارروائی کے لئے حاجی صاحب نے امیر حبیب اللہ خان کے ڈر سے کوئی خط نہیں دیا لیکن نشانی کے طور پر یہ کہا تھا کہ آپ نے جو گھوڑا ان کو بطور تحفہ کے بھیجا تھا، وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔'' گورنر کو اس پر یقین آگیا کیونکہ اس نے حاجی صاحب کو ایک ترکی گھوڑا بھیجا تھا اور رحمت علی کو یہ خبر قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے باتیں کرتے ہوئے اتفاقاً معلوم ہوگئی تھی۔ اس نے بڑی عقلمندی سے اس بات سے فائدہ اٹھایا اور اس طرح پر اپنے لئے روس جانے کا راستہ صاف کرلیا۔

وزیر مالیات مرزا محمد حسین جس کو بعد میں امیر امان اللہ خان نے خود بادشاہ بننے کے بعد سزائے موت دی تھی، بہت ہی زیادہ انگریز پرست تھا۔ اس انگریز پرستی کی وجہ سے اس نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور ان کے ساتھ ہم پر ایک ناپاک سا حملہ کیا۔ اس نے امیر حبیب اللہ خان سے ایک فرمان حاصل کیا جس کا ظاہری مقصد تو یہ تھا کہ ہم کو ہماری لیاقتوں کے مطابق کام پر لگایا جائے، لیکن حقیقت میں اس کے ذریعہ ہماری بے عزتی کرنا مقصود تھا، کیونکہ اس فرمان کے الفاظ ایسے ہتک آمیز تھے کہ ان کو کوئی باعزت شخص

© rasailojaraid.com